ڈاکٹر گل احمد*

تحریکِ ہجرت: علامہ اقبالؒ اور امام احمد رضاؒ

Migration Movement: Allama Iqbal and Imam Ahmad Riza

Abstract

After the failed war of independence in 1857, the Muslims in the subcontinent developed political consciousness a little later than the Hindus. Thanks to the educational movement of Sir Syed, the understanding of the new political system was created, but the conservative class was still incapable of this political consciousness. Therefore, the nationalist scholars started many movements without wisdom and vision. These include the Khilafat movement, the Turk-Mowalat movement and the Hijrat movement. Among them, the Hijrat movement is particularly noteworthy. A fatwa was given that India has become a war center, so all Muslims should migrate from here. Imam Ahmad Raza and Allama Iqbal raised their voices against this fatwa. Maulana Ahmad Raza did not want to withdraw from India under any circumstances and Iqbal was also aware of the harmful effects of this movement, so these two thinkers strongly opposed this movement and played an important role in failure of this movement, in this paper the position of two thinkers of this movement has been examined.

Key Words: Migration Movement, Iqbal, Imam Ahmad Riza, Fatwa

۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی کے بعد مسلمانانِ برصغیر میں ملی شناخت کا احساس بیدار ہوا۔اس احساس کی بیداری کے لیے ایک لائحہ عمل درکار تھا جو سرسید نے جدید تعلیم کی شکل میں عملی طور پر پیش کیا۔اس سے مسلمانوں میں ملی اور سیاسی شعور بیدار ہوا۔اس بیداری کا اثر مسلمانانِ برصغیر کے ہر طبقے پر ہوا جن میں جدید تعلیم سے آراستہ افراد اور علما بھی شامل تھے۔عصرِ حاضر کے تقاضوں کا ادراک جدید تعلیم یافتہ شخصیات میں بہ نسبت علما کے، زیادہ تھا۔علامہ اقبال، قائداعظم کا شمار اسی طبقے سے تھا۔دوسری طرف علما کا نصابِ تعلیم چونکہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عاری تھا؛اس لیے ان میں بیداری کی نوعیت قدرے مختلف تھی اور وہ ہوش کی بجائے جوش سے کام لینے کے قائل تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام علما ہی عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بے خبر تھے۔امام احمد رضا خان کا تعلق ایسے ہی بیدار مغز علما کے طبقے سے تھا جو وقت کی نزاکتوں کا ادراک بھی رکھتے تھے اور فقہانہ بصیرت سے بھی معمور تھے۔مسلمانانِ برصغیر کا مقابلہ تہذیب مغرب کے فرزندوں اور چانکیہ کے پیروکاروں سے تھا جو اپنی مکاری اور عیاری سے ایسا جال

☆ سبجیکٹ اسپیشلسٹ اردو، گورنمنٹ مسلم ہائر اسکینڈری اسکول نمبر 1، صیدپور روڈ راول پنڈی

بنتے کہ اس دور میں سر گرم قوم پرست علما فوراًان کے جال میں جا پھنستے۔ چانکیہ کا پیروکار گاندھی تھا جس کی تربیت افریقہ میں ایک خاص ماحول میں ہوئی تھی۔ مکارانہ سیاست کے اسرار و رموز اس پر عیاں تھے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مذہب مسلمانوں کا ایک جذباتی سہارا ہے۔ اس لیے گاندھی نے مذہب کو اس ڈھنگ سے سیاست میں استعمال کیا کہ قوم پرست علما، دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علمائے ہند اس کے دامنِ فریب سے ایسے وابستہ ہوئے کہ جو جو گاندھی کہتا رہا؛ یہ اس کا شرعی جواز مہیا کرتے رہے۔ وطنی قومیت سے لے کر تحریک خلافت تک، تحریک ترک موالات سے لے کر تحریک کھدر تک اور تحریک ہجرت سے لے کر تقسیم ہندوستان تک یہ گاندھی کے ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے۔ گاندھی تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں مسلمانانِ برصغیر کی اپنے مذہب سے جذباتی وابستگی دیکھ چکا تھا اور اس نے قوم پرست علما اور جمعیت علمائے ہند کی مدد سے اپنے آپ کو ایک متفقہ قائد منوالیا تھا اور ترکِ موالات میں مسلمانوں اور مسلمان تعلیمی اداروں کی معاشی کمر توڑنے کی بھرپور کوشش کر چکا تھا۔ جس کے راستے میں علامہ اقبالؒ اور امام احمد رضاؒ نے بھرپور بند باندھنے کی تگ و تاز کی جس کی وجہ سے اسے مکمل کامیابی نہ مل سکی۔ اس کے رام راج میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ مسلمان تھے جو قوم پرست علما کی گرفت سے آزاد تھے۔ گاندھی اِن مسلمانوں کا قلع قمع چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے مسلمانانِ برصغیر سے مکمل چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ جس کو تحریک ہجرت کہا جاتا ہے۔ گاندھی نے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ۲۲/جون ۱۹۲۰ء کو اپنی "وفادارانہ خدمات" کا تذکرہ کرتے ہوئے وائسرائے ہند کو مخاطب کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے تین اقدام تجویز کیے تھے: جہاد بالسیف، ہجرت اور عدم تعاون۔(۱)

قوم پرست علما گاندھی کو مذہب سے بالاتر شخصیت تصور کرتے تھے جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ گاندھی کٹر ہندو تھا اور ہندو دھرم پر اسے کامل یقین تھا۔ دوسری طرف گاندھی سیکولرازم کا راگ الاپتا رہا۔ گاندھی کی اس منافقانہ حکمت عملی پر اقبالؒ نے کہا تھا:

نگہ دارد برہمن کار خود را   نمی گوید بہ کس اسرار خود را
بمن ۔ گوید کہ از تسبیح بگذر   بدوش خود بر د زنار خود را(۲)

قوم پرست علما کو اپنے دام فریب میں لانے کے لیے گاندھی کبھی کبھی ایسے بیانات جاری کر دیتا جس میں وحدتِ ادیان کا پہلو نکلتا تھا؛ جیسا کہ درج ذیل بیان ہے:

"میرا یہ قلبی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے اور ہم تمام ایک ہی خدا کے عیال ہیں؛ خواہ ہم کسی نام سے کیوں نہ پکارے جائیں۔"(۳)

مولانا ابوالکلام آزاد بھی "تقلیدِ گاندھی" میں وحدتِ ادیان کے نظریے پر عمل پیرا ہو گئے اور قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تم سب ایک ہی رب العالمین کی عیال ہو۔(۴) مولانا آزادؔ نے اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر قرآن کی تفسیر لکھی جس کا ہندی ترجمہ کانگریس کی طرف سے شائع ہوا۔ مسلمانوں کے اس طرز عمل پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی رقم طراز ہیں:

" They were even more alarmed by the fact that the Muslim theologians should search out verses of the Quran and saying of the Prophet for the purpose of supporting Mahatma Gandhi's dicta and Indian National Congress revolution."

مسلمان چوں کہ فطرتاً حریت پسند ہیں؛ اس لیے گاندھی کو یہ خدشہ بھی تھا کہ جوشیلے مسلمان ہندوستان میں کہیں مسلح جدوجہد ہی نہ شروع کر دیں۔ لہٰذا گاندھی اور کانگریس نے قوم پرست علما کی مدد سے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے تحریکِ ہجرت کا پورا منصوبہ ترتیب دیا۔ اس کے لیے شرعی جواز کی ضرورت تھی۔ جس کا اہتمام مولانا ابوالکلام آزاد نے انفرادی طور پر اور جمعیت علمائے ہند نے اجتماعی طور پر کیا۔ جس کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"جمعیت علمائے ہند نے فتویٰ جاری کیا۔ چوں کہ ترکی کے ساتھ صلح کی شرائط مسلمانانِ ہند کی خواہشات کے مطابق طے نہیں پائیں؛ اس لیے ہندوستان دار الحرب بن چکا تھا اور مسلمانوں پر فرض ہے؛ وہ اس ملک سے ہجرت کر کے کسی مسلم ملک میں جا آباد ہوں۔"(۶)

ڈاکٹر جاوید اقبال کے مطابق تحریک ہجرت کے اصل داعی "وہابی" تھے؛ جنھوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا تھا۔ جماعتی سطح پر قوم پرست جماعت جمعیت علمائے ہند نے تحریک ہجرت کا آغاز کروایا تھا جو کہ دیوبند مکتبِ فکر کی جماعت تھی مگر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی جو کہ اسی مکتبِ فکر کے رہنما تھے؛ نے خود ہجرت نہیں کی۔ گویا تحریکِ ہجرت مولانا آزاد، کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کی مشترکہ "کاوش" تھی۔ ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ ہجرت کا ایک مخفی، سیاسی مقصد بھی تھا جس کی بنیاد پر اقبالؒ نے اس سیاسی حکمت عملی کو بھانپ کر اس کی مخالفت کی۔ ڈاکٹر ظفر اقبال نوری لکھتے ہیں:

"تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت اور تحریکِ ترک موالات میں گاندھی کی چال بازیوں سے مسلمانانِ ہند کو جو نقصان اٹھانا پڑا تھا؛ اس نے دو قومی نظریہ پر حضرت اقبالؒ کے یقین کو پختہ تر کر دیا۔(۷)

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک در اصل سوادِ اعظم اہلِ سنت کی بجائے وہابی فرقے کی ایما پر شروع کی گئی تھی۔ انفرادی سطح پر ہجرت کا ایک فتویٰ مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے بھی دیا جو ہندوستان میں اثر و رسوخ رکھنے والے عالم تھے۔ یہ فتویٰ مئی ۱۹۲۰ء کو دیا گیا:

"ہجرت کے متعلق میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر، قلب یا ایمان کو مطمئن نہیں کر سکتے؛ وہ اب اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوں اور ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین (شرع شریف) کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق ممکن ہو۔"(۸)

قاضی محمد عدیل عباسی کے مطابق یہ "انفرادی ہجرت" کا فتویٰ تھا۔(۹) مولانا عبد الباری صرف فتوے تک محدود نہ رہے بلکہ انھوں نے مختلف اخبارات میں ایک مفصل مضمون لکھا؛ جس میں انفرادی ہجرت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

"دارِ حرب سے دارِ اسلام کی جانب ہجرت مستحب ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہو جاتی ہے۔ بل کہ تو طن بلا ضرورتِ شرعیہ حرام ہے۔ ہم لوگ ہندوستان کو دارالاسلام سمجھتے ہیں اور اعزازِ دین اور اعلا کلمۃ اللہ کی نیت سے قیام کیے ہوئے ہیں؛ اس واسطے ہجرت فرض نہیں سمجھتے مگر جب چارہ نہ ہو بجز اس کے کہ یا ہجرت کرے یا مبتلائے مصیبت رہے یا استرضا بالمعصیت کا ارتکاب ہو یا قیامِ وطن سے اس قدر خدمت نہ کر سکیں جتنی کہ باہر نکل کر کر سکتے ہیں تو ان صورتوں میں ہجرت مشروع ہے۔ موجودہ حالت میں ہندوستان سے اگر قابل و ذی استعداد لوگ کابل ہجرت کریں یا محنتی و جفاکش لوگ

ترکِ وطن کر کے وہاں جائیں تو امید ہے کہ اسلام کو فائدۂ زائد حاصل ہو گا اور اپنے وطنِ عزیز کی بھی خدمت کریں گے۔"(۱۰)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا ہندوستان کو دارالسلام بھی سمجھتے ہیں اور قابل لوگوں کو ہجرت کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ گویا مولانا گو مگو کی کیفیت میں تھے اور کوئی واضح اور دوٹوک فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آرہے ہیں لیکن ان کے فتوے سے پنجاب اور صوبہ سرحد (خیبر پختون خواہ) میں ہجرت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس تذبذب کے نتیجے میں مولانا عبدالباریؒ نے مزید ایک اور فتویٰ دیا کہ ہندوستان سے ہجرت فرض نہیں ہے۔ اکراہ کی حالت میں بھی مطلق فرضیت کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔(۱۱) عزیز ہندی نے مزید وضاحت کے لیے آپ کو ایک تار دیا۔ ۴/ اگست ۱۹۲۰ء کو آپ نے ایک برقی پیغام میں فرمایا کہ میں نے ہر مسلمان کو ہجرت کا حکم نہیں دیا۔(۱۲) مولانا عبدالباری کے ان مختلف بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہجرت کو مناسب بھی نہیں سمجھا اور جنھوں نے ہجرت کی؛ ان کو خلافِ شرع بھی نہیں سمجھا اور جنھوں نے ہجرت نہیں کی؛ ان کو بھی الزام نہیں دیا۔ ان بیانات کی روشنی میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مولانا عبدالباری کو تحریکِ ہجرت سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔(۱۳) قاضی محمد عدیل عباسی بھی اسی خیال سے متفق ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے مزاج میں استقامت تھی۔ گاندھی سے ان کی محبت بھی اسی استقامت کا نتیجہ تھی۔ مولانا چونکہ اپنی انا کے خول میں بند تھے؛ اس لیے وہ کسی بھی اہل الرائے سے مشاورت لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ گاندھی کے پروگرام کو اپنا پروگرام قرار دیتے اور دل و جان سے ان کے ارشادات پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ چناں چہ دِلی کے ایک جلسے میں جب گاندھی نے جب ترک، موالات کا پروگرام پیش کیا تو مولانا آزاد بے ساختہ پکار اٹھے:

"مجھے یاد آیا کہ یہی وہ اسکیم تھی جو کچھ عرصہ پہلے ٹالسٹائی نے پیش کی تھی۔..... مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اسی قسم کا پروگرام میں نے الہلال کے کسی مضمون میں پیش کیا تھا۔"(۱۴)

قاضی محمد عدیل عباسی نے "الہلال" کا مذکورہ بالا مضمون ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر نہ مل سکا۔ کیوں کہ اگر مولانا آزادؔ نے لکھا ہوتا تو ملتا۔ مولانا تو صرف اپنی خود پسندی اور شہرت کے دل دادہ تھے۔ اسی طرح جب اقبالؒ نے اپنی مثنویاں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" تخلیق کیں تو مولانا نے انھیں بھی "الہلال" کی بازگشت قرار دیا تھا۔(۱۵) مسلمانانِ برصغیر نے اس مولانا آزاد کی اس "استقامت" کے نتائج خوب بھگتے۔ مولانا آزادؔ نے آخری دم تک اپنی استقامت برقرار رکھی اور قیامِ پاکستان کی مخالفت پر آخری دم تک ڈٹے رہے اور مطالبۂ پاکستان پر یوں گویا ہوئے:

"جہاں تک یہودیوں کے قومی وطن کا مطالبہ ہے؛ اس سے ہم دردی کی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ وہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی علاقہ میں نظم و انصرام پر کوئی اثر نہیں رکھتے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔"(۱۶)

اسرائیل کا مطالبہ جائز اور ہندوستانی مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان ناجائز قرار دینا بھی مولانا کی استقامت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ انانیت کے خول میں بند تھے اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے اور قائد بننے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ ان کی اس انانیت اور خود نمائی نے ان کے کئی منصوبوں میں ایک بنیادی کردار ادا کیا۔ ہندوستان میں کوئی بھی

سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی، ادبی، سماجی یا ثقافتی مسئلہ درپیش ہو؛ مولانا آزادؔ اپنی خود نمائی کے باعث اس کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے اور اپنی اس خود نمائی کی تسکین کے لیے اس کی خاص انداز میں منصوبہ بندی کرتے۔ شاہ عبدالعزیز اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے فتوؤں نے جب کوئی خاطر خواہ اثر نہ کیا تو انھوں نے اپنی انانیت کی تسکین کے لیے ان فتاویٰ سے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ اپنے آپ کو مسلمانانِ برصغیر سے امام تسلیم کروانا تھا۔ لہٰذا ۲۸/ فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں جب تیسری خلافت کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کانفرنس کے دوسرے دن مولانا آزادؔ نے اپنی امامت کی سکیم پیش کی اور ان کو امام نہ تسلیم کرنے والوں کی موت کو جاہلیت کی موت قرار دیتے ہوئے کہا: "امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہو گی۔"(۱۷) مولانا آزادؔ کے دوست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی امامت کے اہل فرد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس منصب کے لیے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چننا ہو گا۔ ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوش مند اور حالتِ زمانہ سے کماحقہ واقف ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے؟"(۱۸)

اس خود پسندی اور انانیت کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار رقم طراز ہیں:

> "رومانوی ادیب ہو یا رہنما؛ وہ انفرادیت اور انانیت کے خول سے کم سے ہی باہر آتا ہے۔ اس کا ذہن طبعاً جمہوریت سے زیادہ آمریت کا پروردہ ہوتا ہے؛ جسے دینی رنگ دیا جائے تو اصطلاحاً اسے امامت کہہ سکتے ہیں۔"(۱۹)

امامت" کی اسکیم پیش کرنے کے بعد مولانا آزاد نے الفاظِ بیعت کا "دینی دستور" بھی مرتب کر لیا اور "طریقہ کار" کی بھی وضاحت کی اور کہا کہ دعوتیں دی جائیں؛ کبھی کھانے کی، کبھی چائے کی، اس طرح بہت سے آدمی اثر میں آجاتے ہیں؛ اس ضمن مولانا آزادؔ کہتے ہیں:

> "دعوت پر جو خرچ ہوتا ہے؛ اس کا کئی گنا زیادہ دس ہزار کم آدمیوں کے جلسے پر خرچ ہو جاتا ہے مگر اس جلسے میں ایک آدمی بھی قابو نہیں آتا لیکن ایک دعوت کے مختصر خرچ سے دس کے دس آدمی تو اپنا خیال ضروری کرنے لگتے ہیں۔"(۲۰)

ان دعوتوں کے اخراجات کا تذکرہ کرتے ہوئے ملیح آبادی لکھتے ہیں:

> "ایک نیک دل مسلمان نے ایک بڑی رقم میرے ہاتھ میں اپنے کاموں کے لیے ڈال رکھی ہے؛ اسی میں سے پچاس روپیہ ماہوار آپ کو پہنچا دیا کروں گا۔"(۲۱)

مولانا آزادؔ نے اپنی "امامت" کے لیے "فنانسر" بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ ایک "منظم تحریک" تھی جس کو پورے انتظام وانصرام کے ساتھ چلانے کی تیاری کی گئی تھی۔ مولانا آزادؔ کی تحریکِ امامت در اصل انگریز اور کانگریس کی مشترکہ حکمت عملی تھی جس کے تحت مولانا آزادؔ کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ ترکی کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے کے بعد ان کو وہاں خلیفۃ المسلمین بنا دیا جائے گا۔(۲۲)۔ اس موقع پر کانگریس نے مولانا آزادؔ کو ہندوستان کی آزادی کے بعد صدارت کی درپردہ پیش کش کی۔ جس کے بعد مولانا آزادؔ نے گاندھی کی ہر آواز پر لبیک کہا اور ان کے تمام "ارشادات" کو "شرعی لباس" پہنانے کا فریضہ

بہ خوبی سرانجام دینے لگے مگر کانگریس اس حد تک متعصب تھی کہ جب ڈاکٹر ذاکر حسین کو بھارت کا صدر منتخب کرنے کے بارے میں غور کیا گیا تو مسز اندرا گاندھی نے اپنی کتاب (MY TRUTH) میں لکھتی ہیں:

"جب ڈاکٹر ذاکر حسین کو بھارت کے صدر کے عہدے کے لیے ہمارا امیدوار نام زد کیا گیا تو ہمارے بہت سے لوگوں کو کسی مسلمان کے صدر مملکت بننے کا خیال پسند نہیں آیا۔ میں نے پارلیمنٹ کے ارکان، صوبائی اسمبلیوں کے ارکان اور دوسرے بہت سے حضرات سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کیا تھا اور ان سب کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین میں سوائے اس کے کوئی خرابی نہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔"(۲۳)

بہر حال مولانا آزاد کا دعوتوں والا مشورہ بہ قول ملیح آبادی نسخۂ کیمیا اور مجرب تھا۔ ایک دوماہ میں سینکڑوں آدمی بیعت میں دا خل ہوئے۔ مولانا آزادؔ نے ایک اور قدم آگے بڑھتے ہوئے مولانا محمود الحسن اور مولانا عبد الباری سے امام الہند کا منصب اپنے لیے تصدیق کرانا چاہا تو دونوں حضرات یہ بات ٹال گئے مگر پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مطابق دونوں نے گفتگو میں آزاد کے امام الہند بننے سے اتفاق کیا۔(۲۴) تحریری جواب مانگنے پر مولانا عبد الباری نے کہا کہ میں اس منصب کے اہل نہیں ہوں اور مولانا آزادؔ کی امامت سے مجھے استنکاف نہیں ہے اور میں یہ تحریک اپنی طرف سے جاری نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی کو منتخب کر کے اعمال کا بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں؛ اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں۔(۲۵) سارا کام مکمل ہونے کے بعد مولانا آزادؔ نے اپنا فتویٰ ہجرت جاری کیا جو اخبار "اہلحدیث" امرت سر کی ۳۰/ جولائی ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ جس میں کہا گیا:

"تمام دلائل شرعیہ، حالاتِ حاضرہ، مصالح مہمہ امت اور مقتضیاتِ مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ میں اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کے لیے بغیر ہجرت کے اور کوئی چارہ شرعی نہیں اور ان تمام مسلمانوں کے لیے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں۔ ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔.... اصل عمل جواب شرعاً در پیش ہے؛ ہجرت ہے۔ اس کے سوا کوئی (چارہ) نہیں۔"(۲۶)

اس فتویٰ "ہجرت" میں مولانا نے اپنی "امامت" کے حقوق بھی محفوظ رکھتے ہوئے بیعت کا حکم دیا اور کہا:

"ہجرت سے مقدم؛ ہجرت کی بیعت ہے؛ بغیر بیعت کے ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔ بس ضروری ہے کہ جو لوگ ہجرت کریں؛ پہلے ہجرت پر بیعت کر لیں۔(۲۷)

اس کے بعد مولانا نے اپنے فتویٰ میں ہجرت کو اپنا ایمان تصور کیا اور کہا کہ یہ میرا یقین اور ایمان ہے اور نہ کوئی قیاسِ رائے اور سیاسی حکمتِ عملی۔ جس طالبِ حق کو مجھ پر اعتماد ہو؛ اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے۔(۲۸) لوگوں نے تو ہجرت کی اس دعوت پر لبیک کہا مگر مولانا خود اس "سعادت" سے محروم ہی رہے۔ تاریخ کی کسی کتاب میں مولانا آزاد کی ذاتی طور پر "ایمان بچانے" کے لیے ہجرت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ان کے قول و فعل میں تضاد کا شکار مسلمانانِ بر صغیر بنے؛ جنھوں نے ہجرت کی اس دعوت پر لبیک کہا اور اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے دام بیچ کر عازم سفر ہوئے۔

فتویٰ آزادؔ کے بعد امیر افغانستان نے ایک بیان دیا کہ افغانستان سارے کا سارا ملک ہندوستانی مہاجرین کو پناہ دینے پر تیار ہے۔

اس اعلان کے ساتھ مولانا عارف حسوی کی ایما پر افغانستان کونسل جنرل نے مزید اعلان کیا کہ افغان حکومت تحریکِ ہجرت کی حمایت کرتی ہے اور ہر مہاجر کو تین ایکڑ زرعی زمین دی جائے گی تاکہ وہ کاشت کاری کر سکیں لیکن مہاجروں کو افغانستان کے داخلی معاملات سے الگ رہنا ہو گا۔ اس اعلان پر عزیز ہندی نے فتح پوری مسجد کی عمارت میں تحریکِ ہجرت کا دفتر قائم کیا؛ ہجرت کے اشتہار چھپوائے اور ان کو پورے ہندوستان میں تقسیم کیا۔ اس اعلان کے بعد مئی ۱۹۲۰ء کو ہجرت کا آغاز ہوا۔ ۷/ مئی ۱۹۲۰ء کو مہاجرین نے سرحد پار کی۔ خان عبد الغفار خان نے عزیز ہندی کو مشورہ دیا کہ افغانستان کی اجازت کے بغیر ہجرت نہ شروع کی جائے۔ اس کے لیے وہ (خان عبد الغفار خان) خود افغانستان جائیں گے۔ خان عبد الغفار خان افغانستان گئے اور ایک مہینے تک قیام کیا مگر افغانستان کی حکومت نے انھیں کوئی اہمیت نہ دی جس پر خان صاحب واپس چارسدہ آ گئے اور عزیز ہندی افغانستان میں رہ گئے۔ ۱۳/ اگست ۱۹۲۰ء کو افغانستان نے ہندوستان والی اپنی سرحدیں بند کر دیں۔ ظفر حسن ایبک جو اس ہجرت کے چشم دید گواہ تھے؛ لکھتے ہیں کہ ہجرت کے فتوے پر سادہ لوح مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے مول پر بیچ دیے اور نتیجہ اور عاقبت کو سوچے بغیر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔(۲۹) جب کہ افغانستان کی اندرونی حالت بیان کرتے ہوئے ظفر حسن کہتے ہیں کہ افغانستان ایک پس ماندہ ملک ہے جس میں قابلِ کاشت زمین بہت کم ہے اور کابل اور جلال آباد میں کوئی ہوٹل بھی نہ تھا۔ لہٰذا مہاجرین کے کھانے پینے کا کوئی انتظام بھی نہ ہوا۔ اکثر تو پیدل آئے جنھوں نے اپنے بال بچوں کو ساتھ لیا انھوں نے اپنی بیل گاڑیوں پر سامان لاد کر ان کو ان پر سوار کیا یا کرائے پر گاڑیاں لیں۔ یہ مہاجر افغانی سرحد سے جلال آباد تک بہت بے سروسامانی سے پہنچے۔ جو اپنی گاڑیاں لائے تھے؛ ان کے بیلوں کو چارہ تک نہ مل سکا۔ افغانستان کے لوگوں کا رویہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بے چاری پردہ پوش عورتیں وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں۔ بعض بد اخلاق کابلیوں نے ان پر سخن اندازی کی؛ بعض لوگوں نے تو روٹی کھانا خریدنے کے لیے اپنا اثاث البیت بھی فروخت کرنا شروع کر دیا جس کو کابلیوں نے آدھے دام میں بھی نہ لیا۔(۳۰) کابل میں افغانوں نے مہاجرین کی سخت مخالفت کی اور انھیں غیر ملکی قرار دے دیا۔ جس پر حکام افغانستان نے تمام مہاجرین کو اکٹھا کر کے پانچ منٹ میں کابل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ مہاجرین نے اب ایران کا رخ کیا مگر وہاں بھی مشکلات وہی تھیں۔ کابل سے واپسی پر افغانی دو رویہ کھڑے ہو کر مہاجرین کو چور کہہ رہے تھے۔ اسی دوران انگریزوں اور افغانوں کے درمیان عارضی صلح نامہ ہو گیا تھا۔ جس پر مہاجرین کو سخت غصہ تھا، اس لیے بعض مہاجرین نے ترکستان اور روس کی طرف ہجرت کی۔ وہاں سے پیدل اناطولیہ پہنچ کر واپس اپنے وطن پہنچ گئے۔ مہاجرین کی کثیر تعداد ان پڑھ کاشت کاروں اور غریب لوگوں پر مشتمل تھی جو ساہوکاروں، زمین داروں اور قوم پرست علما کے فتویٰ کی بدولت ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے انگریز نے اپنے ایجنٹوں کو بھی استعمال کیا۔ اس سلسلے میں ظفر حسن ایبک لکھتے ہیں: "گورنمنٹ کے بعض ایجنٹوں نے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ان کو ہجرت کی ترغیب دی۔(۳۱) قاضی محمد عدیل عباسی نے بھی انگریزوں کے گرگوں کی انھی حرکتوں کی تصدیق کی ہے۔(۳۲)

مہاجرین کی تعداد کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ پنجاب خلافت کمیٹی نے ایک لاکھ بیس ہزار کا اندازہ لگایا تھا جب کہ ملک لعل خان کے مطابق مہاجرین کی تعداد دو لاکھ پینتیس ہزار ہے۔ صلاح الدین ناسک نے صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب کے مہاجرین کی تعداد ۸۱ ہزار بیان کی ہے۔(۳۳) ۱۴/ اگست ۱۹۲۰ء کے "زمیندار" کے مطابق ۳۱ تا ۴۱ ہزار افراد افغانستان روانہ ہوئے۔ ساتھ ہی مہاجرین کو حوصلہ دیا گیا کہ وہ مایوس نہ ہوں اور ہجرت جاری رکھیں۔ ایک مہاجر کے مطابق ایک وقت میں کابل میں ایک لاکھ پچیس ہزار تک مہاجرین موجود تھے اور مزید مہاجرین کی ٹولیوں کی آمد جاری تھی۔(۳۴) مشہور صحافی حمید اختر کے مطابق مہاجرین کی

تعداد ۵ لاکھ سے ۳۰ لاکھ تک تھی۔(۳۵)ڈاکٹر جاوید اقبال بھی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ مہاجرین کو بہ امر مجبوری واپس آنا پڑا اور انھو ں نے جو جو صعوبتیں برداشت کیں؛ ان کا شمار کرنا محال ہے۔(۳۶)ڈاکٹر عبد السلام خورشید کہتے ہیں کہ ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور یوں بے یارو مددگار بچے کھچے مہاجرین دوبارہ برصغیر میں پناہ لینے کے لیے پلٹ آئے جہاں پہلے ہی ان کے لیے کچھ باقی نہ رہا تھا۔(۳۷)الغرض مہاجرین کا یہ سیلاب الٹا پھرا، اور ہندوستان کی طرف مڑا۔ نتیجتاً ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہو ئے اور اس تحریک سے جنھیں فائدہ ہوا تھا وہ بہ ظاہر انگریز تھے لیکن پسِ پردہ ہندو تھے؛ جنھوں نے اس تحریک کے نتیجے میں کافی دولت کمائی اور مسلمانوں سے جائیدادیں کوڑیوں کے بھاؤ خریدیں؛ جس سے ہندوؤں کی تجارت کو مزید تقویت ملی اور ملکی معیشت پر ان کی اجارہ داری مزید مستحکم ہوئی۔

ہجرت کو شرعی جواز فراہم کرنے والوں اور قائدینِ ہجرت کے قول و فعل کا تضاد ملاحظہ ہو کہ جن علمائے کرام نے ہندوستا ن میں بیٹھ کر ہجرت کے فتوے دیے؛ ان میں سے تو کسی کو "دارالحرب" سے ہجرت کر کے "دارالسلام" جانے کی توفیق بھی نہ ہوئی اور لاکھوں مسلمانوں کو بے گھر کر کے اور ان کو معاشی طور پر دستِ نگر بنا کر اکیلے ہی چھوڑ دیا گیا۔ اس نازک صورت حال میں مسلمانوں کو بے بسی کی تصویر بنانے کے بعد مولانا آزادؔ نے ان کے زخموں پر مزید یوں نمک پاشی کی:

> "اصلی میدان، ہندوستان کا میدان تھا؛ اندرونی میدان تھا۔ اصلی فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا تھا۔ اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان میں، ترکِ موالات کے میدان میں، قربانی کے ولولے کے میدان میں، مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیتے تو دنیا کی کو ن سی قوت ہے؟ جو آپ کو شکست دے سکتی تھی۔(۳۸)

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہجرت کوئی قابل فہم رویہ نہیں تھا اور نہ ہی مسلمانانِ برصغیر کے لیے کوئی دانش مندانہ چیز تھی۔ آزادی ہجرت سے نہیں؛ جدوجہد اور عمل سے ملتی ہے جو ہندوستان میں رہ کر ممکن تھا۔ اس لیے مسلمانانِ برصغیر نے متحد ہو کر انگریز اور ہندوؤں کے خلاف ہندوستان میں رہ کر جدوجہد کا آغاز کیا اور آخر کار اپنا الگ وطن پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

علامہ اقبالؒ ایک دوراندیش مفکر تھے جو جوش سے ہوش کے داعی تھے۔ اس کے علاوہ اقتصادیات سے ان کی دل چسپی اور رغبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی پہلی نثری تالیف ہی "علم الاقتصاد" ہے۔ اقبال کا عہد مسلمانوں کی پستی اور معاشی پس ماندگی کا دور تھا۔ استعمار کا تعلق سرمایہ دار طبقے سے تھا۔ جس نے اپنی صنعتوں کے فروغ اور سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کے لیے انسانیت کی ایک بہت بڑی تعداد کو غلام بنا لیا تھا۔ اس لیے علامہ اقبال نے سب سے پہلے اسے مسئلے کی طرف توجہ مبذول کی۔ علاوہ ازیں آپ کی شاعری میں بھی مزدور اور سرمایہ دار کے موضوعات بھی تواتر کے ساتھ ملتے ہیں۔ معاشی مسئلہ اقبال کی نظر میں اتنا اہم تھا کہ آپ نے برصغیر میں اٹھنے والی ہر تحریک کا دینی اور اقتصادی نقطہ نظر سے تجزیہ کیا اور اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ ہجرت کی سخت مخالفت کے اسباب بھی یہی تھے۔ تحریکِ ہجرت پر اقبال کے مؤقف کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بارے میں اقبال کے نقطۂ نظر سے آگاہی حاصل کی جائے۔

اقبالؒ اسلام کو ایک متحرک دین قرار دیتے ہیں اور اس کی بنیاد قرآن مجید کو ٹھہراتے ہیں۔ ہجرت؛ اصلِ حرکت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اقبالؒ نے ہجرت کے موضوع پر بہت کم لکھا ہے۔ چند اشعار "رموزِ بے خودی" میں اس موضوع پر موجود ہیں۔ اسی

طرح نثر میں بھی اقبال نے جب ہجرت کا تذکرہ کیا ہے تو اسے وطنی قومیت کے رد میں دلیل کے طور پر بیان کیا ہے۔ ''وطن پرستی'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"وطن پرستی بھی بت پرستی کی ایک نازک صورت ہے۔ مختلف قوموں کے وطنی ترانے میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی ایک مادی شے کی پرستش سے عبارت ہے۔... اسلام جس چیز کو مٹانے کے لیے آیا تھا؛ اسے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا بنیادی اصول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی جائے پیدائش سے ہجرت فرما کر مدینے میں قیام وو صال غالباً اسی حقیقت کی طرف ایک مخفی اشارہ ہے۔(۳۹)

اسی مضمون کو شاعرانہ جلال کے ساتھ یوں رقم کرتے ہیں:

بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دِکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اِس بت کو ملا دے
ہے ترکِ وطن سنّتِ محبوبؐ الٰہی
دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی

(۴۰)

اسی طرح ''رموزِ بے خودی'' میں قصیدہ کعب بن زہیرؓ کی مثال دیتے ہوئے اقبالؒ نے لکھا ہے کہ جب کعب بن زبیرؓ نے اپنا قصیدہ ''بانت سعاد'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کرتے ہوئے آپ کو ''سیوف الہند'' قرار دیا تو آپؐ نے اس ترکیب کو ''سیوف اللہ'' سے بدل دیا۔ گویا آپ نے جغرافیے کو رد کرتے ہوئے مومن کا وطن سارا جہان قرار دیا تھا۔ اس لیے اقبالؒ نے ہجرت کو مسلم قومیت کی دلیل قرار دیا اور ہجرت کی غرض وغایت بھی بیان کی:

عقدہ قومیت مسلم کشود
از وطن آقای ما ہجرت نمود
قصہ گویان حق زما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است(۴۱)

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ کی طرف ہجرت کرنا وطنیت کا رد تھا اور ساتھ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ مکہ ''دارالحرب'' بن چکا تھا؛ لہٰذا اب ''دارالسلام'' کی طرف ہجرت کرنا ضروری تھا تاکہ اسلام کا پیغام توحید تمام اقوام و ملل میں پھیلایا جا سکے۔ اقبالؒ؛ ہجرت کے اس پہلو سے اتفاق رکھتے تھے مگر برصغیر میں صورتِ حال مکّے سے یک سر مختلف تھی۔ ایک تو برصغیر میں واجبِ الطاعت امام موجود نہ تھا؛ اس کے لیے اقبالؒ نے تمام علمائے کرام کی ایک کانفرنس کی تجویز دی تھی۔ جس کا فتویٰ ہر مکتبِ

فکر کے مسلمان کے لیے حجت ہوتا۔(۴۲) دوسرا پہلو ہندوستان کا دارالسلام ہونا تھا۔ ہندوستان دارالحرب نہ تھا، دارالحرب اس جگہ کو کہتے ہیں،؛ جہاں اسلام کا ایک بھی رکن یا شعار اسلام کا کوئی بھی کام ادا کرنے کی ممانعت ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنے، اذان دینے، مساجد و مدارس قائم کرنے کی اجازت تھی۔ اس لیے یہ پہلو بھی اقبالؒ کے نزدیک تحریکِ ہجرت کو غلط ثابت کرتا تھا۔

اقبالؒ نے مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر تحریک ہجرت کی مخالفت کی اور جب تحریکِ ہجرت کے دوران مہاجرین نے جوش و جذبے میں ہجرت کا آغاز کیا تو اقبالؒ نے اس اقدام پر افسوس کا اظہار کیا: خط بہ نام پروفیسر محمد اکبر منیر محررہ ۴/ اگست ۱۹۲۰ء میں اقبال میں لکھتے ہیں:

> "زیادہ کیا عرض کروں؟..... ہندوستان اور بالخصوص پنجاب سے بے شمار لوگ (مسلمان) افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اس وقت پندرہ بیس ہزار آدمی (اور ممکن ہے کہ زیادہ) جا چکا ہو گا۔"(۴۳)

مندرجہ بالا متن اقبال کے ہجرت کے متعلق خیالات کا بین ثبوت ہے کہ آپ مسلمانانِ برصغیر کے اس اقدام کو مستحسن نظروں سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ اقبالؒ کے خیال میں مسلمانوں کا یہ اقدام انھیں معاشی خودکشی کی طرف دھکیل رہا تھا اور اس کا سبب علما کے دینی نہیں سیاسی فتوے تھے۔ اسی طرح ایک دوسرے خط میں اقبالؒ مہاجرین کی حالتِ زار بیان کرتے ہیں؛ خط بہ نام گرامی محررہ ۲۰/ جولائی ۱۸۲۰ء میں لکھتے ہیں:

> "سندھی مہاجرینِ کابل کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ان کے استقبال کو حاضر تھے۔ اہل لاہور نے بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم کیا۔"(۴۴)

اس خط کی عبارت سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ اقبالؒ نے اس تحریک کے ثمرات کو سخت ناپسند کیا۔

اقبالؒ مسلم قوم کو طاقت ور دیکھنا چاہتے تھے جو اقبالؒ کے عہد میں "جہدِ للبقا" کے عمل سے گزر رہی تھی۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں معیشت نے "تنازع للبقا" کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔ ان حالات میں مسلم قوم برصغیر میں خاص حالات کے تناظر میں ارتقائی تبدیلیوں سے گزر رہی تھی۔ ان ارتقائی تبدیلیوں میں ذرا سی غفلت مسلم قوم کی شناخت تک کو مٹا سکتی تھی۔ اس لیے اقبالؒ نے ہر معاملے اور ہر تحریک کا بہ غور جائزہ لیا اور اس کے بعد ایک منطقی رائے قائم کی جو تاریخ نے درست ثابت کی۔ تحریکِ ہجرت بھی مسلم قومیت کو مٹانے اور کم زور کرنے کا ایک حربہ تھا۔ اس لیے اقبالؒ نے تحریکِ ہجرت کو مسلم قوم کے لیے مضر خیال کیا۔ جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی جاگیریں چھین لی گئیں؛ انھیں مناصب سے محروم کر دیا گیا اور ان کی زندگی کو اجیرن بنا دیا گیا۔ سرسید نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اور مسلم قوم کی معاشی حالت کو سدھارنے کے لیے جدید تعلیم کی طرف ان کو رغبت دلائی تاکہ وہ نئے نظام میں روزگار کے مواقع حاصل کرنے میں کام یاب ہو سکیں۔ ہندوؤں نے انگریز سے خوب فوائد حاصل کیے۔ تجارت پر پہلے ہی ان کی گرفت تھی؛ اب انگریزوں کی ایما سے وہ مزید مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں مسلمانوں نے اپنی رہی سہی معاشی طاقت بھی گنوا دی تھی۔ جس سے مسلمان مزید کم زور اقلیت میں تبدیل ہو گئے۔ اب گاندھی کی ایما پر قوم پرست علما نے ہجرت کا فتویٰ دے کر مسلمانوں کے تابو

ت میں آخری کیل ٹھونکنے کی بھی بھرپور کوشش کررہے تھے۔ دوسری طرف ہندو مسلمانوں کی جائیدادیں خرید کر معاشی طور پر مزید طاقت ور ہوتے چلے گئے۔ گاندھی اور کانگریس کا یہی منشا تھا کہ مسلمانوں کو یا تو ہندوستان سے نکال دیا جائے یا انھیں اتنا دستِ نگر کر دیا جائے کہ وہ سوراج حاصل کرنے کے بعد سر اٹھانے کے قابل نہ ہو سکیں۔ ان حالات کا ادراک صاحبِ بصیرت شخص کو ہی ہو سکتا تھا؛ اس لیے اقبالؒ نے تحریکِ ہجرت کی مخالفت کی تا کہ مسلمان ہندوؤں کی ان چالوں سے محفوظ رہ سکیں اور وہ ہندوستان میں اپنی مسلم شناخت کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ قوم پرست علما مسلمانوں کی شناخت ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے جس کی واضح مثال مولانا سندھی کا "موقتہ حکومت ہند" کا قیام ہے؛ یہ حکومت افغانستان میں قائم کی گئی جس کا صدر ایک "ہندو راجا مہندر پرتاب" کو بنایا گیا اور جس کے وزیر داخلہ مولانا سندھی خود بنے۔ (۴۵) لہٰذا ان اسباب کو دیکھتے ہوئے اقبالؒ نے تحریکِ ہجرت کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار رہنے کا درس دیا اور انھیں کانگریس اور قوم پرست علما سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔

امام احمد رضاؒ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بصیرت سے مزین فقہی تھے جو دین و سیاست میں جدائی کے قائل نہ تھے، بل کہ سیاستِ مصطفویٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا شیوہ قرار دیتے تھے۔ اس لیے جب بھی سیاست دین سے ٹکرائی تو آپؒ مردِ میدان بن کر سامنے آئے۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات اور پھر تحریکِ ہجرت کو شرعی لبادے میں پیش کر کے جب مسلمانانِ برصغیر کی تباہی کا سامان پیدا کیا گیا تو آپؒ نے شرعی دلائل سے "دارالحرب" کے فلسفے کا رد کیا اور ہندوستان کو "دارالسلام" قرار دے کر ہجرت کی تحریک کی شدید مخالفت کی۔ تحریکِ ہجرت پر آپؒ کی رائے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضاؒ کی ہجرت کے بارے میں آرا کا ذکر کیا جائے تا کہ ہجرت پر ان کے موقف کو سمجھا جا سکے۔ آپ نے نے ہجرت کی دو اقسام بیان کی ہیں:

ا۔ ہجرت عامہ اور ۲۔ ہجرت خاصہ

ہجرتِ عامہ یہ ہے کہ تمام اہلِ وطن ترکِ وطن کر کے چلے جائیں۔ یہ ہجرت دارالحرب ہونے کی صورت میں ہر مسلمان پر فرض ہے؛ جس سے مستثنیٰ صرف عورتیں، بچے اور عاجز مرد ہیں جو نکل نہیں سکتے۔ باقی سب پر فرض ہے اس کے علاوہ جو باوصف قدرت دارالحرب میں سکونت رکھے اور ہجرت نہ کرے؛ مستحقِ عذاب ہے۔ ہجرت خاصہ یہ ہے کہ صرف خاص اشخاص ہجرت کریں۔ تمام لوگوں پر یہ ہجرت فرض نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آپ نے ہجرتِ خاصہ کی تین صورتیں بیان کی ہیں:

ا۔ اگر کوئی شخص کسی وجہِ خاص سے کسی مقامِ خاص میں اپنے فرائضِ دینیہ بجانہ لا سکے اور دوسری جگہ ممکن ہو تو اگر یہ خاص اسی مکان میں ہے؛ اس پر فرض ہے کہ یہ مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلا جائے اور اگر اس محلہ میں معذور ہو تو دوسرے محلے میں اٹھ جائے اور اس شہر میں مجبور ہو تو دوسرے شہر میں وعلیٰ ہذا القیاس۔

ب۔ دوسرے وہ کہ یہاں اپنے فرائضِ مذہبی بجالانے سے عاجز نہیں اور اس کے ضعیف ماں یا باپ یا بیوی بچے جن کا نفقہ اس پر فرض ہے؛ وہ نہ جا سکیں گے یا نہ جائیں گے اور اس کے چلے جانے سے بے وسیلہ رہ جائیں گے تو اس کو دارالاسلام سے ہجرت کرنا حرام ہے۔

ج۔ تیسرے وہ کہ فرائض سے عاجز ہے نہ اس کی حاجت؛ اسے اختیار ہے، رہے یا چلا جائے؛ جو اس کی مصلحت سے ہو۔ (۴۶)

آپ نے ہجرت کی اقسام اور ان کی صورتیں بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ رہا دارالاسلام؛ اس سے ہجرتِ عامہ حرام ہے۔ اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ دارالاسلام سے ہجرت میں مساجد کی ویرانی و بے حرمتی، قبورِ

مسلمین کی بربادی، عورتیں، بچوں اور ضعیفوں کی تباہی ہو گی۔(۴۷)اور تحریکِ ہجرت میں یہی ہوا کہ مسلمان تباہ حال ہندوستان لو ٹے۔ جہاں نہ ان کے گھر بچے تھے اور نہ کاروبار؛اس لیے امام احمد رضاؒ نے ہندوستان کو دارالسلام قرار دیا تھا۔اس کے مقابلے میں علمائے دیوبند ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے تھے جس کی وجہ ان کی گاندھی نواز حکمتِ عملی تھی۔ جس کے لیے قرآن وحدیث کی غلط تعبیریں پیش کی گئیں اور گاندھی کی اس سازش کو شرعی جواز مہیا کیا گیا۔ذیل میں علمائے دیوبند کے چند اکابرین کے فتویٰ جات کو پیش کیا گیا ہے تا کہ ہجرت کے بارے میں امام احمد رضاؒ اور ان کے مؤقف کو تقابلی جائزے سے واضح کیا جا سکے:

مولانا رشید احمد گنگوہی سے جب ہندوستان کے دارالحرب یا دارالاسلام کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے تین مختلف فتوے دیے؛جن میں کوئی تطبیق ہی نہیں؛

پہلا فتویٰ ملاحظہ ہو:

سوال: ملکِ ہندوستان مملوکہ نصاریٰ اور ممالک محروسہ نوابانِ ہند اور راجگان دارالحرب ہے یا دارا لاسلام اور کافر ان ملکوں کے حاکم ہوں یا محکوم حربی ہیں یا ذمی، خواہ ہندو ہوں یا کافر یا غیر ہندو اور کافر ات حربیات ہیں یا ذمیات؟

جواب:"سب ہندوستان بندہ کے نزدیک دارالحرب ہے اور یہاں کی کافرات حربیہ ہیں۔(۴۸)

دوسرا فتویٰ ملاحظہ ہو:

سوال: ہند بہ قول امام صاحبین کیا دارالحرب ہے؟

جواب:"ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علما کا ہے۔بہ ظاہر تحقیق حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی؛حسب اپنی تحقیق کے سب نے فرمایا ہے اور اصل مسئلہ میں کسی کو خلاف نہیں اور بندہ کو بھی خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیتِ ہند کی ہے؟فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔(۴۹)

تیسرا فتویٰ بھی درج ذیل ہے:

"دارالحرب ہونا ہندوستان کا مختلف علما حال میں ہے۔اکثر دارالسلام کہتے ہیں اور بعض دارالحرب کہتے ہیں؛بندہ اس میں فیصلہ نہیں کرتا۔(۵۰)

ان فتاویٰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تذبذب کا شکار ہیں اور کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔کسی سائل کو دارالحرب کا فتویٰ واضح طور پر دے رہے ہیں،؛کسی کو اپنی لاعلمی کے بارے میں بتا رہے ہیں اور کسی سائل کو کوئی واضح جواب دینے سے معذوری ظاہر کر رہے ہیں۔مولانا قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔ ان کا مؤقف ہے:"ہندوستان دارالحرب است۔(۵۱)مولانا خلیل احمد انبیٹھوی بھی دارالحرب والے عقیدے پر قائم ہیں اور کہتے ہیں:"ہندوستان دارالحرب ہے؛یہاں رہنا مسلمانوں کو حرام اور ہجرت کرنا واجب ہے۔"(۵۲)مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی مختلف جگہ پر مختلف رائے کا اظہار کیا ہے؛کہتے ہیں:

"کسی نے دریافت کیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں فرمایا کہ عموماً دارالحرب کے معنی غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جہاں حرب واجب ہو؛سو اس معنی میں تو ہندوستان دارالحرب نہیں؛کیوں کہ یہاں بہ بوجہ معاہدہ کے حرب درست نہیں۔"(۵۳)

ایک دوسرے موقع پر درج ذیل خیالات کا اظہار کیا:

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ دارالحرب کے معنی دارالکفر ہیں لیکن پھر بھی اس دارالحرب کی دو قسمیں ہیں؛ ایک دارالامن ایک دارالخوف؛ دارالامن میں بہت احکام مثلِ دارالاسلام کے ہوتے ہیں؛ سو ہندوستان دارالحرب ہے، لیکن ہے دارالامن۔(۵۴)

ان مختلف آرا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علمائے دیوبند کے اکابرین تذبذب کا شکار تھے اور کوئی واضح مؤقف اپنانے سے قاصر نظر آتے ہیں لیکن اس مسئلے کے بارے میں جب امام احمد رضاؒ سے رائے طلب کی گئی تو آپؒ نے ایک واضح مؤقف اختیار کیا اور اپنا رسالہ "اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام" لکھ کر اپنا واضح مؤقف پیش کیا۔ اس لیے اقبالؒ نے آپؒ کے بارے میں کہا تھا: "آپ اپنی رائے کا اظہار بہت سمجھ کر کرتے ہیں اور ان کو کبھی اپنی رائے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔(۵۵) آپؒ نے اپنے اس رسالے میں "دارالحرب" کے فلسفے کو رد کر دیا اور آیاتِ قرآن، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ، آئمہ کرام اور فقہائے دین کے ارشادات کی روشنی میں ہندوستان کو "دارالاسلام" ثابت کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد آپ کی بصیرت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا بریلویؒ کے خیال میں غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کا پورا پورا حق تھا۔ انھوں نے ایک ہزار سال سے زیادہ کامیاب حکومت کی تھی۔ مولانا بریلویؒ اس حق سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے؛ اسی لیے انھوں نے رسالہ "اعلام الاعلام" لکھ کر اپنے مؤقف کا اظہار کیا۔(۵۶)

ہجرت اور ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں آپ سے مختلف لوگوں نے استفسار کیے جن میں سے پہلا سوال محلہ سیلانی بریلی سے پوچھا گیا؛ جس میں اس نے کابل میں ہجرت کرنے کی شرعی حیثیت پوچھی تھی۔ آپ نے اس کے جواب میں کہا: "کابل کی ہجرت اسے جائز نہیں۔(۵۷)

دوسرا سوال تاج الدین خیاط نے لاہور سے ہجرت کے احکام و شرائط کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ دارالسلام سے ہجرت کا حکم نہیں اور ہندوستان دارالحرب نہیں؛ دارالسلام ہے۔(۵۸)

تیسرا فتویٰ مرزا علی بیگ نے بدایوں سے پوچھا تھا جو درج ذیل تین سوالات پر مشتمل تھا:

۱۔ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام؟

۲۔ اس زمانہ کے یہود و نصاریٰ کتابی ہیں یا نہیں؟

۳۔ روافض وغیرہ ہم مبتدعین کہ کفار داخل مرتدین ہیں یا نہیں؟

آپ پہلے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"ہمارے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ؛ بل کہ علمائے ثلثہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم کے مذہب پر ہندوستان دارالسلام ہے؛ ہرگز دارالحرب نہیں۔ جو تین باتیں امام اعظم امام الائمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک درکار ہیں؛ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں احکام شرک علانیہ جاری ہوں اور شریعتِ اسلام کے احکام و شعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے مگر یہ بات بحمد اللہ یہاں قطعاً موجود نہیں۔"(۵۹)

اس کے بعد آپ نے شعارِ اسلام کی ایک مختصر سی فہرست گنوائی جو مسلمانانِ برصغیر کھلم کھلا ادا کرتے ہیں:

"اہلِ اسلام جمعہ و عیدین و اذان و اقامت و نماز با جماعت و غیر ہا شعائرِ شریعت بغیر مزاحمت علی الاعلان ادا کرتے ہیں۔ فرائض، نکاح، رضاع، طلاق، عدۃ، رجعت، مہر، خلع، نفقات، حضانت، نسب، ہبہ، وقف، وصیت، شفعہ وغیرہا؛ بہت معاملاتِ مسلمین ہماری شریعت غرّاء بیضاء کی بناپر فیصل ہوتے ہیں کہ ان امور میں حضرات علما سے فتویٰ لینا اور اسی پر عمل و حکم کرنا حکام انگریزی کو بھی ضرور ہوتا ہے۔(۶۰)

اس کے بعد آپؒ نے دینِ اسلام کی آفاقیت و شوکت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہماری شریعت کی شوکت و سطوت کا یہ عالم ہے کہ مخالفین بھی اس کا اتباع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے امام الاعظم ابو حنیفہؒ کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے ان کا مؤقف واضح کیا کہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک دارالسلام تین شرائط سے دارالحرب ہوتا ہے:

ا۔ جن میں ایک یہ کہ وہاں کفار کے احکام علانیہ جاری کیے جائیں اور وہاں اسلام کا کوئی حکم نافذ نہ کیا جائے۔

۲۔ اہلِ حرب ہمارے علاقہ پر غلبہ پالیں یا ہمارے کسی علاقہ کے شہری مرتد ہو کر وہاں غلبہ پالیں اور کفر کے احکام جاری کر دیں۔

۳۔ وہاں کے ذمی لوگ عہد کو توڑ کر غلبہ حاصل کر لیں۔

ان مندرجہ بالا صورتوں میں وہ علاقہ صرف تین شرطوں سے دارالحرب بنے گا۔(۶۱)

اس کے بعد آپ نے ملا خسروی کے حوالے سے دارالحرب کے دارالسلام بننے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"دارالحرب اسلامی احکام جاری کرنے مثلاً: جمعہ و عیدین وہاں ادا کرنے سے دارالسلام بن جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں کوئی اصلی کافر بھی موجود ہو۔(۶۲)

آپؒ نے فقہا کی کتب سے دلائل کے انبار لگا دیے اور ہندوستان کو دارالاسلام ثابت کیا۔ آپ نے جامع الفصولین، بالفصول العماد، البرھان شرح مواہب الرحمان، الدر المنتقی علی ہامش مجمع الانھر، جامع الرموز، حاشیہ الطحاوی، حاشیہ شامیہ، ردالمختار، فتاویٰ ہندیہ، فتاویٰ عالم گیریہ، درشرب شرح نقایہ، تنویر الابصار، درمختار کے حوالہ جات دے کر دارالحرب اور دارالاسلام کی وضاحت کی اور مومنانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا اور کہا کہ اسلام غالب ہوتا ہے؛ مغلوب نہیں ہوتا۔(۶۳) امام احمد رضاؒ کے نزدیک ہندوستان کو دارالحرب قرار دینا دراصل غلامی کو قبول کرنا اور انگریز کے قبضے کو جائز قرار دینا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد اس ضمن میں کہتے ہیں:

"ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی (امام احمد رضاؒ) ہندوستان پر انگریز کے قبضے کو غاصبانہ سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ بہ قدر استطاعت ملک کی آزادی کے لیے کوشش کریں۔ دارالحرب قرار دے کر تو اپنے حق سے عملاً دست بردار ہونا ہے؛ کیوں کہ اس طرح ہجرت فرض ہو جاتی ہے اور استخلاصِ وطن کے لیے کوشش کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ایک ہزار سال حکومت کر کے اتنی جلدی اپنے حق سے دست بردار ہونا نہ قرین عقل ہے اور نہ قرین انصاف۔"(۶۵)

امام احمد رضاؒ حریت پسند تھے اور مسلمانانِ برصغیر کی آزادی کا سودا نہیں کرنا چاہتے تھے؛ اس لیے انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام کے لیے تحریکِ ہجرت کی شدید مخالفت کی تاکہ وہ اپنی آزادی کے لیے ہندوستان میں رہ کر جدوجہد کر سکیں۔ دارالحرب کے مسئلے میں ایک اور اہم نقطہ یہ ہے کہ جب کسی علاقے کو دارالحرب قرار دے دیا جاتا ہے تو وہاں سود کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے یعنی اس علاقے میں سود لیا اور دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں سودی کاروبار خوب پھلے پھولے۔ ہندوؤں اور قوم پرست علما کی معاشی حالت خوب سنورے۔ اپنی ذاتی منفعت کے لیے تحریکِ ہجرت کی حمایت کی سازش کو امام احمد رضاؒ نے یوں بے نقاب کیا:

> "عجب ان سے جو تحلیلِ ربوٰ کے لیے (جس کی حرمت نصوصِ قاطعۂ قرآنیہ سے ثابت اور کیسی کیسی وعیدیں اس پر وارد) اس ملک کو دارالحرب ٹھہرائیں اور باوجود قدرت واستطاعت ہجرت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ گویا یہ بلاد اسی دن کے لیے دارالحرب ہوئے تھے کہ مزے سے سود کے لطف اڑایئے اور بآرام تمام وطن مالوف میں بسر فرمایئے؛ استغفر اللہ افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔"(۶۵)

آپؒ مصلحت کے تحت پولی ٹیکل فتویٰ دینے کے خلاف تھے یعنی جب معاشی مصالح کی بنا پر سود لینے کو جی چاہا تو ہندوستان کو دارالحرب بنا دیا اور جب سیاسی مصالح سوراج کے حصول کے لیے مسلمانوں کو ترکِ وطن کے لیے مجبور کرنا چاہا تو پھر دارالحرب بنا دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر انگریز کی حکومت میں ہندوستان کو دارالحرب مان بھی لیا جائے تو آج ہندوستان میں ہندو راج قائم ہے تو آج ہندوستان دارالحرب کیوں نہیں ہے؟ اور قوم پرست علما کی اولادیں آج ہندوستان سے ہجرت کیوں نہیں کرتیں؟ لیکن فتوے کے پیچھے خاص مقاصد کار فرما تھے جن کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد رقم طراز ہیں:

> "ہندوستان میں شعائرِ احکامِ اسلام پر عمل کرنے میں انگریزوں کی عمل داری میں جو آزادی تھی؛ اب اتنی آزادی نہیں؛ اس سے شک ہوتا ہے کہ فیصلے مصلحتِ وقت کے تحت کیے گئے اور مصلحت اندیشی نے سیاسی سطح پر مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔"(۶۶)

اس وقت ہندوستان کو امام احمد رضاؒ نے دارالاسلام قرار دیا تھا۔ آج ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے والے خود ہندوستان میں بیٹھ کر ہندوستان کو عملاً دارالاسلام قرار دے رہے ہیں۔ گویا یہ حضرات امام احمد رضاؒ کے فتوے اور بصیرت کے معترف ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے فتوؤں کو غلط ثابت کر رہے ہیں۔ یہ امام احمد رضاؒ کی بصیرت، دور اندیشی اور دانش مندانہ فکر کا نتیجہ ہے؛ جسے تاریخ آج سچ ثابت کر رہی ہے۔

ہجرت کے بعد اس کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "ہجرت بعض کا بے سود ہونا بھی عقلاً معلوم تھا ہی؛ اب تجربۃً مشہود بھی ہو لیا۔ سو ان غریب مسلمانوں کی بے سروسامانی وآوارگی وپریشانی وحسرت وپشیمانی کے اور بھی کوئی فائدہ مترتب ہوا؟(۶۷)

آپ کی کہی ہوئی ساری باتیں درست ثابت ہوئیں۔ آپ کی انھی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے لکھا ہے:

"وہ ہنود کی سیاسی چال سے بہ خوبی باخبر تھے۔ اس لیے سیاستِ ملّیہ کے ہر اہم موڑ پر انھوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا۔ ہنود کے چھپے ارادوں اور ہندو مسلم اتحاد کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا۔(۶۸)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امام احمد رضاؒ نے تحریکِ ہجرت کے دینی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ آپ ایک مستقل مزاج فقیہ تھے؛ اس لیے ہندوستان کی تمام تحاریک میں آپ کی مستقل مزاجی نے آپ کی شخصیت کو مزید ابھارا۔ آپ نے اپنی بصیرت اور دانش مندی سے مسلمانانِ برصغیر کی رہنمائی کی۔ آپؒ کا مقصد صرف اور صرف اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کا تحفظ تھا۔ تاریخ نے آپ کے نقطۂ نظر کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جو آپ کی عزت و عظمت کی دلیل ہے۔

حوالے و حواشی

۱۔ قاضی، محمد عدیل عباسی،، "تحریکِ خلافت" ،(دہلی؛ قومی کونسل برائے فروغ اردو، اشاعتِ دوم ۱۹۹۷) ص:۱۵۶

۲۔ اقبال، "کلیاتِ اقبال (فارسی)"، (لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعتِ دوم، ۱۹۹۴ء)، ص:۹۷۹

۳۔، روزنامہ ہریجن، ۹/ فروری ۱۹۴۶ء

۴۔ خان، شاہد حسین، "تحریکِ ہجرت"، (کراچی؛ ادارہ تحقیقاتِ افکار و تحریکاتِ ملی، ۱۹۸۹)، ص:۱۰۰

۵۔ قریشی اشتیاق حسین، ڈاکٹر، Dr. Ishtiaq Hussain Qureshi, " Ulema in Politics"(Karachi: University of Karachi, 2006) p:20

۶۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، "زندہ رود"، جلد دوم، (لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعتِ دوم، ۱۹۸۷ء)، ص:۲۵۰

۷۔ نوری، ظفر اقبال ڈاکٹر، "دو قومی نظریہ: علامہ اقبال اور امام احمد رضاؒ" مشمولہ، ماہنامہ، معافِ رضاؒ، کراچی؛ ۲۰۰۸ء ص:۷۰

۸ تا ۹۔ قاضی، محمد عدیل عباسی،، تحریکِ خلافت، ص ۱۳۷

۱۰۔ قاضی، محمد عدیل عباسی، تحریکِ خلافت، ص:۱۴۰

۱۱۔ خان، حسین، تحریکِ ہجرت، تحریک ہجرت، ص:۹۱،

۱۲۔ روزنامہ زمیندار، لاہور؛ ۱۴/ اگست ۱۹۲۰ء، ص:۴

۱۳۔ ذولفقار، غلام حسین پروفیسر ،ڈاکٹر، "تحریکِ ہجرت"،(لاہور: بزم اقبال، طبع اول، جنوری ۱۹۹۷)، ص:۲۸

۱۴۔ Abul Kalam Azad,India Wins freedom, Delhi: Sani.H. Panhwar,2017, P:9

۱۵۔ ملک، فتح محمد، پروفیسر، "اقبال اور الہلال"، روزنامہ نوائے وقت؛راولپنڈی؛۱۰/ دسمبر ۲۰۰۲ء، ص:ادب

۱۶۔ آزاد، ابوالکلام، مولانا، "آزادی ہند"، مترجم رئیس احمد جعفری،(لاہور: مقبول اکیڈمی، سن ندارد)، ص:۱۳۰

۱۷۔ قاضی، محمد عدیل عباسی، تحریکِ خلافت، ص:۱۲۷

۱۸۔ ذولفقار، غلام حسین، پروفیسر ،ڈاکٹر، "تحریکِ ہجرت"، ص:۳۰

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ قاضی، محمد عدیل عباسی، "تحریکِ خلافت"، ص:۱۲۹

۲۱۔ ایضاً

۲۲ہمد انی،عبدالستار، مولانا، "امام احمد رضا: ایک مظلوم مفکر"،(لاہور؛رومی پبلی کیشنز، طبع اول، ۲۰۰۲ء)ص:۱۵۴

۲۳۔ روزنامہ جنگ، کراچی؛۲۹/ نومبر ۱۹۸۷ء، کالم، ص:۱۲

۲۴۔ قاضی، محمد عدیل عباسی، تحریکِ خلافت، ص:۱۲۹

۲۵۔ ذولفقار، غلام حسین، پروفیسر، "ڈاکٹر، تحریکِ ہجرت"، ص:۳۲

۲۶۔ ایضاً، "تحریکِ ہجرت کا پس منظر"، سہ ماہی، اقبال، لاہور؛ جلد ۴۴، شمارہ ۲، اپریل ۱۹۹۷ء، ص:۴۹

۲۷۔ قاضی، محمد عدیل عباسی، "تحریکِ خلافت"، ص:۱۳۴

۲۸۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، تحریکِ ہجرت، ص:۳۵

۲۹۔ ذولفقار، غلام حسین، پروفیسر ،"ڈاکٹر، تحریکِ ہجرت"، ص:۲۲

۳۰۔ قاضی، محمد عدیل عباسی، "تحریکِ خلافت"، ص:۱۳۵

۳۱۔، ذولفقار، غلام حسین، پروفیسر ،"ڈاکٹر، تحریکِ ہجرت"، ص:۲۳

۳۲۔ ایضاً

۳۴۔ ایبک، ظفر حسین، "خاطرات"، مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،(لاہور؛سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص:۱۸۷

۳۵۔ حمید اختر، "تاریخ کا سبق"، دوسرا حصہ، روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد؛۱۶/ اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص:۱۲

۳۶۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، "زندہ رود"، جلد دوم،(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، زشاعت سوم، ۱۹۸۴)، ص:۱۹۹۔ ۲۰۰

۳۷۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، "تاریخ تحریکِ پاکستان"،(اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم، ۲۰۰۲ء)، ص:۱۷۲

۳۸۔ ملیح آبادی، عبدالرزاق، "ذکرِ آزاد"،(کلکتہ؛ دفتر آزادی ہند، ۱۹۶۰ء)، ص ۱۴۵

۳۹۔ اقبال، شذرات فکر اقبال، مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال، مترجم ڈاکٹر افتخاراحمد صدیقی، لاہو؛ مجلس ترقی ادب، طبع دوم، مئی ۱۹۸۳، ص ۸۳

۴۰۔ اقبال، "کلیاتِ اقبال فارسی"،(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت دوم، ۱۹۹۴،)ص:۷۸۱

۴۱۔ ایضاً، ص:۴۱۱

۴۲۔ شاہد، محمد حنیف، "اقبال اور انجمنِ حمایتِ اسلام"، (لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، جولائی ۱۹۷۶)، ص:۹۸۔۱۰۳

۴۳۔ اقبال، "اقبال نامہ"، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، یک جلدی، (لاہور؛ اقبال اکادمی، ۲۰۰۵ء)، ص:۴۵۵

۴۴۔ قریشی، عبد اللہ، مکاتیب اقبال بنام گرامی، (لاہور: اقبال کادمی، طبع دوم، جون ۱۹۸۱)، ص:۱۶۰۔۱۶۲

۴۵۔ خورشید، عبد السلام ڈاکٹر، "تاریخ تحریکِ پاکستان"، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم، ۲۰۰۲ء)، ص:۴۸

۴۶۔ احمد رضاؒ، امام، "فتاویٰ رضویہ"، جلد ۱۴، (لاہور؛ رضا فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء)، ص:۱۳۱

۴۷۔ ایضاً

۴۹۔ گنگوہی، رشید احمد، مولانا، "فتاویٰ رشیدیہ"، (کراچی؛ محمد سعید اینڈ سنز، کامل، س۔ن)، ص:۵۰۵

۵۰۔ ایضاً، ص:۷

۵۱۔ نانوتوی، قاسم، مولانا، "قاسم العلوم"، جلد سوم، (کراچی؛ دار لاشاعت، س۔ن)، ص:۳۵

۵۲۔ میرٹھی، عاشق الٰہی مولانا، "تذکرۃ الخلیل"، (سہارن پور؛ مکتبہ خلیلہ، س۔ن)، ص:۳۴۹

۵۳۔ الہٰ آبادی، محمد عیسیٰ، مولانا، "کمالاتِ اشرفیہ"، (بھون: تالیفاتِ اشرفیہ، س۔ن)، ص:۱۴۷

۵۴۔ تھانوی، اشرف علی، مولانا، (الافاضاتِ الیومیہ، جلد چہارم، قسط ۱۹، دہلی: جید برقی پریس)، ۱۹۴۱، ص:۴۲۶

۵۵۔ شاہین، رحیم بخش، ڈاکٹر، "اورقِ گم گشتہ"، (لاہور؛ اسلامک پبلی کیشنز، اشاعتِ دوم، مارچ ۱۹۷۹ء)، ص:۱۰۱

۵۶۔ احمد، محمد مسعود، پروفیسر، ڈاکٹر، "حیاتِ مولانا احمد رضا خان بریلویؒ"، (کراچی؛ ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضاؒ، بارِ چہارم، ۱۹۹۹ء)، ص:۱۰۳

۵۷۔ ۱۱احمد رضاؒ، امام، "فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴"، ص:۱۰۱

۵۸۔ ایضاً، ص:۱۰۳

۵۹۔ ایضاً، ص:۱۰۵

۶۰ تا ۶۱۔ ایضاً، ص:۱۰۶

۶۲۔ ایضاً۔ ص:۱۰۷

۶۳۔ ایضاً، ص:۱۱۰۔۱۱۱

۶۴۔ احمد، محمد مسعود، پروفیسر، ڈاکٹر، "حیاتِ مولانا احمد رضا خانؒ بریلوی"، ص:۱۰۵

۶۵۔ ۱۱احمد رضاؒ، امام، "فتاویٰ رضویہ"، جلد ۱۴، ص:۱۱۴

۶۶۔ احمد، محمد مسعود، پروفیسر، ڈاکٹر، "حیاتِ مولانا احمد رضا خانؒ بریلوی"، ص:۱۰۵

۶۷۔ احمد رضاؒ، امام، "فتاویٰ رضویہ"، جلد ۱۴، ص:۴۱۶

۶۸۔، احمد، محمد مسعود، پروفیسر، ڈاکٹر، "حیاتِ مولانا احمد رضا خان بریلویؒ"، ص:۱۰۰۔۱۰۲